بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اہل مغرب کی ذہنی غلامی سے ہمیں جو عظیم نقصانات پہنچے اُن میں ایک نقصان مسلمانوں کی اپنے ماضی سے بغاوت بھی ہے۔ یوں تو سلف سے خلف کا انحراف تاریخ کے ہر دور میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے لیکن آج تک اس نے کسی باقاعدہ دعوت اور منظم تحریک کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے اس دور میں یہ رجحان ایک اجتماعی سازش کی حیثیت سے نمودار ہو رہا ہے۔ اس تحریک کے علمبردار اب علانیہ ایسے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں جن کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہمارے اسلاف (معاذ اللہ) سب جاہل اور بے عقل تھے۔ اُن کے جو جی میں آیا اسے انھوں نے حق قرار دیا اور جو چیز اپنی خواہشِ نفس کے خلاف پائی، اُسے باطل ٹھہرایا۔ انھوں نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ کیا وہ صرف اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے تھا۔ اُن کی نگاہیں اپنے وقتی مسائل میں الجھی رہیں، اُس سے آگے نہ تو انھیں کچھ نظر آیا اور نہ انھوں نے دیکھنے کی کوشش کی ان کے افکار و اعمال اگر کچھ قدر و قیمت اپنے اندر رکھتے ہیں تو وہ صرف اسی دور کے لیے تھے جس میں انھوں نے زندگی گذاری۔ مگر ہمارے لیے وہ عبث اور بیکار ہیں۔ ہماری ساری ملی روایات محض بیکار کی زنجیریں ہیں جنھوں نے ہماری اجتماعی زندگی کو بالکل مفلوج کر رکھا ہے۔ اس قوم کی نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ اُسے کسی طرح ماضی کے چنگل سے آزاد کر دیا جائے۔ یہ قوم جب تک ان بندھنوں میں بندھی رہے گی وہ کوئی قدم بھی آگے بڑھانے کے قابل نہ ہوگی۔ جس طرح دنیا کی ہر قوم نے ماضی کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اس کے بوجھ تلے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ ان کا ماضی مستقبل کی تعمیر میں اُن کے کسی کام نہیں آسکتا۔ وہ ایک متعفن نعش ہے جسے اس قوم نے محض اپنی حماقت کی بنا پر سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس ملت کی بنیادی کمزوری یہی ہے کہ یہ ہمیشہ پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھتی ہے۔[1]

---

[1] ابھی چند مہینوں کی بات ہے کہ لاہور کے ایک مشہور کالج کے ایک نامور پروفیسر صاحب نے ۱۸۵۷ء کی یادگار مناتے ہوئے مسلمانوں کی اس بنیادی کمزوری کی طرف بڑے کھلے الفاظ میں اشارہ فرمایا تھا۔

قریب قریب یہی وہ خیالات ہیں جو تجدد پسند اصحاب تھوڑے بہت لفظی تغیر کے ساتھ وقتاً فوقتاً مختلف پلیٹ فارموں سے دُہراتے رہتے ہیں۔

مغرب پرست "زعمائے قوم" اس رجحان پر خواہ کتنے ہی مسرور و دلشاد ہوں لیکن اس ملت کے وہ حقیقی خیر خواہ جو اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ اس بات کو پوری طرح جانتے ہیں کہ یہ رجحان، دوسری اقوام کے لیے تو ممکن ہے اپنے اندر افادیت کا کوئی پہلو رکھتا ہو، لیکن ملت بیضا کے حق میں یہ سمِ قاتل ہے۔ بغاوت کا یہی جذبہ اگر تحریک بن کر پھیل نکلا تو یہ امت مسلمہ کے سفینہ کو بالکل بے لنگر کر دے گا اور پھر حوادثات کے تھپیڑے جس طرف چاہیں گے اسے لے جائیں گے۔ اس کے پاس کوئی چیز ایسی باقی نہ رہے گی جو اُسے ثبات دے۔ اس دنیا میں ترقی کا تو ذکر ہی کیا اس کے لیے اپنا وجود تک کو برقرار رکھنا محال ہو جائے گا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس طرزِ فکر کا، جو امت کے اندر بعض مخصوص مصالح کی بنا پر بالکل غیر محسوس طریقے سے پھیلایا جا رہا ہے، قدرے تفصیل جائزہ لے کر بتایا جائے کہ یورپ میں، جہاں اس نظریہ نے جنم لیا، اس کی پیدائش کے کیا اسباب تھے کن کن فلسفوں نے عقلی بنیاد کے طور پر اس کی تہ میں کام کیا، اُن میں کیا کیا فکری لغزشیں پائی جاتی ہیں، وہاں ماضی سے بغاوت کے کون سے نتائج برآمد ہوئے، اور کیا ہمارے حالات بھی آج وہی ہیں جو یورپ کے تھے، اور کیا ہمارے لیے ماضی سے انحراف ممکن بھی ہے یا نہیں۔

وہ لوگ جنھوں نے یورپی زندگی کا ایک سرسری سا مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اہلِ یورپ جس مذہب سے سب سے پہلے آشنا ہوئے وہ کوئی انقلاب انگیز نظام فکر و عمل نہ تھا، جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہوتا۔ وہ چند مسحور کُن مگر بے روح رسوم کا ایک ایسا ڈھانچہ تھا جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اُس نے ہمیشہ انسان کے تاریک ترین پہلوؤں پر زور دیا اور اُس کے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا کہ انسان کی سرشت کا خمیر شر سے اٹھایا گیا ہے، اس لیے

ہمیں اس سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع نہ کرنی چاہیے۔ اُس کے لیے نجات کی اگر کوئی صورت ممکن ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ دنیا اور اہل دنیا سے سارے تعلقات منقطع کر کے اپنے "آسمانی باپ" کی پرستش کرے۔ اس طرزِ فکر نے بلاشبہ آغاز میں بعض ایسے لوگ پیدا کیے جو اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے لیے زندہ رہے اور انھیں کی حفاظت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ اسی خیال کی کرشمہ سازی تھی کہ مسیحی علماء رومیوں ایسی دنیا پرست اور بے دین قوم کے درمیان رہ کر بھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہوئے۔ وہ ان کی تباہ کاریوں سے الگ، سیاسی شورشوں سے دور، اپنے آقا کے ظہور کے مشتاق، اپنے مذہب کی تعلیمات کے جوش و غلو میں سرشار اور اپنے گرد و پیش کی مسموم ہوا سے بہت حد تک غیر متاثر رہے۔ لیکن اس کا ایک نہایت ہی افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا اور اس کے معاملات کی زمام کار خدا سے غافل لوگوں کے ہاتھ میں آگئی اور دیندار اور پارسا لوگ اپنی خانقاہوں میں کنارہ کش رہے۔ اس بنا پر عیسائیت نے جو روایات ترکہ میں چھوڑی ہیں وہ کوئی ایسی نہیں جو انسان کو اُس کی اجتماعی زندگی میں راہنمائی دیتیں، یا جن کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکتے یا اُن کی بنیاد پر کسی تمدن کی تعمیر ہو سکتی۔ ان روایات میں جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا، جس سے انسان صرف اپنی انفرادی زندگی میں رشد و ہدایت حاصل کر سکتا تھا۔

مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اسی وقت تک قائم رہا جب تک یہ مذہب سینٹ پال کی بدعت کے اثرات سے کسی حد تک محفوظ رہا۔ اس کے اثرات جتنے بڑھتے گئے یہ روشنی بھی مدھم پڑتی چلی گئی اور مسیحیت کے اندر تمام جاہلیتوں اور بغویات کی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد، جو قابلِ ذکر لوگ بھی عیسائیت کی آغوش میں آئے وہ سب کے سب وہی تھے جنہوں نے اپنے ذہن سے خیالات گھڑ گھڑ کر اس مذہب میں اس طرح داخل کیے گویا کہ وہ بھی تعلیماتِ الٰہی کا ایک اہم جزو ہیں۔ ان کے ہاتھوں مسیحیت یونانی تصوّرات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت (NEO PLATONISM) اور رہبانیت کا ایک ایسا ملغوبہ بن گئی جس میں حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیم کا حصہ بہت کم تھا اور سروں کے خرافات زیادہ تھے۔

اس سے نہ تو روح میں سوز و گداز پیدا ہوتا، نہ عقل کی تسلی اور تشفی ہوتی اور نہ احساسات و جذبات متحرک ہوتے۔ مسیحیت کی یہ شکل انسانیت کی رہبری کرنے کی بجائے اس کے راستے میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئی۔ انسانیت کے کارواں نے جب آگے کی طرف قدم اٹھانے شروع کیے تو اس نے اپنے لیے کوئی راستہ بجز اس کے کھلا ہوا نہ پایا کہ اس چٹان کو توڑ کر آگے نکلے۔ خود حاملینِ مذہب کے دل میں بھی جب کبھی مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا خیال پیدا ہوا تو انھیں اپنے ماضی سے بغاوت کر کے ہی اسے عملی جامہ پہنانا پڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوتھر کی "تحریک اصلاحِ مذہب" کی بنیاد ہی ماضی سے انحراف پر رکھی گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو تحریک مذہب کو زندہ کرنے کے لیے اٹھی تھی، اس نے آخر کار اس مذہب کو بالکل لادینیت کے راستہ پر ڈال کر اس کے وجود کے حقیقی مقصد ہی کو ختم کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ عیسائی مذہب کے پیشواؤں نے کچھ تو اس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا کر جس نے تورات و انجیل کی سماوی اصلیت کو پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا تھا، کچھ اس جہالت کی بنا پر جو صدیوں سے اُن کا سرمایۂ امتیاز بنی رہی، اور کچھ اُن سیاسی مصلحتوں سے مجبور ہو کر جنھوں نے اُن کے دین کو مبدل بہ دنیا کر دیا، ان باتوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا جن سے انھیں کوئی دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ انسان کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتے دیتے اور نجاتِ اُخروی کی راہ دکھاتے دکھاتے علم و حکمت کے بھی سبق دینے لگے اور خاص سائنس کے مسائل پر بھی ملہم من اللہ کی حیثیت سے رائے زنی کرنے لگے۔ اس غلط بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقائقِ فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہوا تو اُن کے دعاوی جنھیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل ہو گئے اور اُن کے پیرو اُن کو جھوٹا سمجھ کر کفر و الحاد کی طرف نکل گئے اور مغربی دنیا نہ صرف مذہب کی قید سے آزاد ہو گئی بلکہ انھوں نے ماضی کے بارے میں ایک بڑا ہی گھٹیا تصور اپنے ذہین میں بٹھا لیا۔

معاملہ اگر صرف یہیں تک رہتا تو پھر بھی وہ ایسا نہ تھا کہ کبھی سنبھل ہی نہ سکتا۔ لیکن مذہب کے علمبرداروں

نے محض اپنی حماقت کی وجہ سے آخر کار لوگوں کو مذہب سے بالکل متنفر ہی کر کے چھوڑا۔ انھوں نے خالص علمی مسائل کو وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ انھیں اذعانی عقائد کی حیثیت سے زبردستی منوانے کے لیے نہایت خوفناک مظالم ڈھائے۔ ہر وہ شخص جس نے ان پادریوں کے پیش کردہ افکار سے ذرا بھی اختلاف کیا اُس کا بڑی سختی سے احتساب کیا گیا، اور اُسے نہایت ہی عبرتناک سزا دی گئی۔ اس محکمۂ احتساب نے جن لوگوں کو سزائیں دیں اُن کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں، اور ان میں بیس ہزار وہ تھے جن کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہی زندہ جلائے جانے والوں میں علمِ ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو تھا جس کا سب سے بڑا جرم اربابِ کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل ہے۔ مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو بھی محض اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ سورج کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔ اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور جبر و دستیوں نے مغرب کے ذہین طبقے کو مذہب سے بالکل باغی کر دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محض جذباتی کشمکش کی وجہ سے، جس میں عیسائی پادریوں کا بہت حد تک دخل ہے، یورپ میں تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے اور مذہب، اس کی تعلیمات اور روایات کے متعلق اُن کے اندر ایک شدید نفرت پیدا ہو گئی۔

دنیائے مسیحیت میں یہ انقلاب بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ اس کی وجہ سے سب سے پہلے تو اخلاقی بندھن ٹوٹے۔ پھر اس نے انسانوں کے دلوں میں محبتِ الٰہی کی بجائے دنیا پرستی پیدا کر دی اور مذہب بھی مادی ترقی کے حصول کے لیے بطور ایک ذریعہ کے استعمال ہونے لگا۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ زندگی جو کچھ ہے وہ خارج میں ہے، باطن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے اندرونی احساسات، اور باطنی کیفیات بھی ہماری مادی زندگی کے رُخِ زیبا کا عکس ہیں۔ ہمارے مذہبی معتقدات، مابعد الطبیعی تصورات، معیارِ خیر و شر سب ہمارے مادی ماحول کی پیداوار ہیں۔ چونکہ انسانیت نے سائنس کی دنیا میں حیرت انگیز ترقی کر کے ایجادات و اکتشافات کی مدد سے زندگی کو مادی اعتبار سے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ آرام دہ اور پر آسائش بنا دیا ہے، اس لیے غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہم

پہلے سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہیں۔ ماضی کی ساری چیزیں خواہ وہ اوزار و آلات ہوں، ذرائع حمل و نقل ہوں، یا مذہبی معتقدات، سب کے سب زمانہ حال کے مقابلے میں بوسیدہ اور ناکارہ ہیں۔ اس لیے اگر آپ ایک شخص سے آج یہ مطالبہ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے کہ تم اس دورِ ترقی میں پتھر کے اوزار استعمال کرو، تو آخر اُس سے یہ مطالبہ کیوں کرتے ہیں کہ تم ماضی کی روایات سے وابستہ رہو۔ اگر دورِ ماضی کی مادی ترقیاں آج کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں تو ماضی کا مذہب، آج کے لیے کس طرح مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انسانیت نے جو چولی اتار کر پھینک دی ہے، بس قبا کو اپنی قامت پر تنگ ہونے کی وجہ سے چاک کر دیا ہے، جن جنگلوں کو خیرباد کہہ دیا ہے، اُن کی طرف بلانے والوں کی آواز رجعت پسندی اور مذہبی دیوانگی کی آواز ہے۔

اب ذرا آپ یہ دیکھیں کہ اس غلط نظریے کی تائید میں کس قسم کے فلسفے گھڑے گئے۔ اس میں پہلا فلسفہ وہ ہے جو ہیگل نے پیش کیا۔ اس کی فنی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقا دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور پھر امتزاج و مصالحت سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی کا ہر دور ایک وحدت، ایک کُل ہے۔ اس دور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے (مثلاً معاشی، سیاسی، تمدنی) اور انسان کے اخلاقی و عقلی اور مذہبی تصورات ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ پھر یہ "روحِ مطلق" اپنی فطری رفتار کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، تو خود ایک تہذیب کے مختلف شعبوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے اور وہ جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ مدت برسرِ پیکار رہنے کے بعد بالآخر تغیر کے طالبوں اور حالتِ سابقہ کے حامیوں میں صلح ہو جاتی ہے، دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر کو چھانٹ کر علیحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایسی تہذیبی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پہلی وحدت سے کہیں زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے ہر آنے والا دور پہلے دور سے لازماً افضل و اکمل ہوتا ہے کیونکہ اس میں پچھلے سارے

ادوار کے صالح عناصر بھی شامل ہوتے ہیں اور نئے دور کی خوبیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔

اس کے بعد مارکس نے معاشرتی ارتقار کے ثبوت کے لیے ایک دوسرا طرز فکر اختیار کیا اور روح کے تصور کو الگ کر کے خالص مادی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخی ارتقار کی بنیاد قرار دے دیا۔ ہیگل کے نزدیک تو زمانہ روح مطلق کے اشارہ پر ترقی کر رہا تھا، مگر مارکس کے قول کے مطابق صرف معاشی محرکات ہی تاریخی ارتقا کی بنیاد ہیں، اور اُن میں حقیقی اہمیت ذرائع پیداوار کو حاصل ہے، اور یہی ذرائع کسی دور کی ذہنی، سیاسی اور مذہبی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ مارکس کے نزدیک انسانیت کے ارتقار کی صورت یہ ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اس کا اثر براہ راست اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے، اس سے زندگی کی ساری اقدار از خود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام معرض وجود میں آتا ہے۔ اب دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے، بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزار شامل ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے زیادہ صحت مند ہوگا۔

تیسرا مفکر جس نے اپنے طرز فکر سے معاشرتی ارتقار (SOCIAL EVOLUTION) کے نظریہ کو زبردست قوت فراہم کی وہ ڈارون ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جانداروں کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے، ترقی کرنے اور شکل و صورت میں تغیر کرنے کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا ہے۔ چونکہ جانداروں کی تعداد خوراک اور قیام حیات کی دوسری احتیاجات کی بہ نسبت بہت سرعت سے بڑھتی ہے اس لیے ہر جاندار کو اپنے بقار کے لیے دوسروں سے مسلسل جنگ کرنی پڑتی ہے۔ ڈارون کائنات کو ایک میدان کارزار کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس میں ہر آن، ہر طرف زندگی اور بقا کے لیے طاقتور کمزوروں کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ لہٰذا جو جاندار اپنے دشمنوں سے بہتر قوت حیات کا مالک ہے وہی زندہ رہتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں جو زندہ

رہتا ہے وہی بہتر ہے اور اسی کو باقی رہنے کا استحقاق ہے۔ قدرت اس کشمکش سے خود بخود بہتر کو بدتر سے، طاقتور کو کمزور سے، چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیتی ہے۔ انسان بھی تنازع للبقاء کی اسی بھٹی میں سے گزر کر آیا ہے۔ اس لیے اس کی موجودہ حالت، پہلی حالتوں سے لازمی طور پر ارفع اور اعلیٰ ہے۔

آپ اب ان تینوں نظریات کو جمع کریں اور دیکھیں کہ اس کا حاصل کیا ہے۔

- انسانیت جبری طور پر ترقی کی طرف جا رہی ہے۔
- ہر دور پچھلے سارے ادوار سے بہتر ہوتا ہے۔
- ماضی وہ گرد ہے جسے رہوارِ زمانہ ہر قدم کے ساتھ پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔
- ماضی کی جن چیزوں کو حال نے چھوڑ دیا ہے وہ کمزور اور غیر صالح تھیں اسی لیے زمانہ نے انھیں چھانٹ کر الگ کر دیا۔ اب اگر ہم انھیں اپناتے ہیں تو درحقیقت خود اپنے موت کے وارنٹ پر دستخط ثبت کرتے ہیں۔
- انسانی ترقی کا اصل معیار مادی طاقت ہے۔ چونکہ آج یہ انسانیت کے پاس پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہے، اس لیے انسانیت آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ان تینوں تصورات نے مل جل کر معاشرتی ارتقاء کا جو نظریہ پیدا کیا ہے اُس کی رُو سے انسان کی مادی ترقی ہی انسانی زندگی کی معراج ٹھیری ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مادی ترقی شعورِ انسانی کی مدد کے لیے ہے، اس میں از خود تخلیق کی صلاحیت نہیں نفسِ انسانی میں اصل تخلیقی قوت اس کا وہ اندرونی روحانی جذبہ ہے جو زمان و مکان کے فرق کے باوجود ایک ہی رہتا ہے۔ آج کے انسان اور زمنہ وسطیٰ کے انسان میں فطرت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ جو محرکات آج اُسے جنگ و صلح، دوستی و دشمنی، تعمیر و تخریب پر ابھارتے ہیں وہ ان محرکات سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں جو عہدِ عتیق میں انسانوں کو سرگرمِ عمل کرتے تھے۔ انسان کی بنیادی فطرت آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پہلے تھی۔ اور یہی چیز انسانی زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے مختلف تہذیب و تمدن معرضِ وجود میں آتے ہیں

انسان کا مادی ماحول کسی قوم کے احساسات کی صورت گری نہیں کرتا بلکہ اُس کے احساسات و جذبات، اُس کے ذہنی میلانات، اس کے لیے ایک نظامِ تہذیب کو معرضِ وجود میں لاتے ہیں۔ اگر ان مفکرین کے قول کے مطابق یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اس عمل ارتقاء اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کے تحت ہو رہا ہے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں کسی فعل پر بھی نیک و بد، محمود و مذموم، یا حق و باطل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو چیز خارجی حالات سے بالکل میکانکی طور پر پیدا ہو جائے وہ نہ تو اچھی کہلا سکتی ہے اور نہ ہی بُری۔ کیا دنیا کا کوئی عقلمند اسے تسلیم کرنے کو تیار ہے کہ اس دنیا میں جو شر اور فساد پھیلا ہوا ہے، جو ظلم و ستم ہو رہا ہے، وہ بالکل صحیح اور درست ہے؟ آپ اگر محولہ بالا گزارشات پر ذرا گہری نگاہ ڈالیں تو آپ خود محسوس کریں گے کہ استدلال کا یہ طریق اور مقدمات کی یہ ترتیب ارتقائے انسانی کی اس میکانکی توجیہ کے عین مطابق ہے۔ ان مفکرین کی سب سے بڑی فکری لغزش یہی ہے کہ وہ مادی زندگی کی ترقی پر اس قدر فریفتہ ہوئے کہ انھوں نے اسے ہی اصل قرار دے دیا اور پھر بے جان، بے حس اور بے ارادہ مادے سے چند اصول وضع کر کے انھیں شعور، ارادہ، اور احساس خیر و شر رکھنے والے انسانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی اور یہ سمجھنے لگے کہ جس طرح آج کی برق رفتار سواری پہلے زمانے کے گدھے سے بہتر ہے اور اب اس کو چھوڑ کر اُس کی طرف پلٹا نہیں جا سکتا اسی طرح زمانۂ حال، ماضی سے ہر لحاظ سے ترقی یافتہ ہے، اور اس میں رہ کر پیچھے کی طرف رجوع کرنا سراسر غیر دانشمندی ہے، سوچنے کا یہ انداز بالکل غلط ہے۔ انسان اور جمادات میں ایک نوعی فرق ہے۔

ممکن ہے ماضی میں پائے جانے والے آلات و اوزار، اس کے ذرائع حمل و نقل ہمارے لیے کسی افادیت کے حامل نہ ہوں، مگر قوموں کی زندگی میں ماضی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ دنیا کا ہر فرد، اور دنیا کی ہر قوم ماضی کے بطن سے جنم لیتی ہے، ماضی کی آغوش ہی میں پل کر جوان ہوتی ہے، ماضی اُس کی تربیت کرتا ہے۔ اس کی سیرت و کردار کی تشکیل میں، اُس کے افکار و تصورات کی تعمیر میں، اُس کے احساس و جذبات کی ترتیب میں ماضی ایک قوم کے لیے وہی کچھ کرتا ہے جو ایک ماں بچہ کے لیے کرتی ہے جس طرح ایک بچہ کی نفسیات

کا مطالعہ کرتے وقت آپ اُس کی ماں کے اطوار، اُس کی عادات کو نظر انداز نہیں کر سکتے، اسی طرح ایک قوم کا نفسیاتی جائزہ لیتے ہوئے بھی آپ اُس کے ماضی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جس طرح کوئی غیرت مند انسان ماں سے اپنا تعلق منقطع کرنا گوارہ نہیں کرتا، اسی طرح کوئی باوقار قوم بھی روایات سے اپنا رشتہ توڑنا پسند نہیں کرتی۔

ماضی اور اس کی اچھی روایات سے وابستگی، قوموں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ وہ روشنی کا مینار ہے جس سے قومیں جادۂ مستقیم سے ہٹنے نہیں پاتیں۔ یہ وہ لنگر ہے جو ان کے سفینوں کو طوفانوں کی دستبرد سے بچاتا ہے، یہ وہ سنگِ میل ہے جو ان کے لیے راستہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ دنیا کی ہر وہ قوم جس میں، ذرا بھی بصیرت ہے اُس نے اپنے آپ کو ماضی سے ہمیشہ جوڑ کر رکھا۔ ماضی سے اس تعلق کی بنا پر اس قوم کے قدم بڑے آہستہ اور سوچ سمجھ کر اُٹھے، اُس نے ہر کام کو جذبات کی شعلہ فشانیوں میں کرنے کی بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کا قافلہ بجائے آوارہ و سرگرداں پھرنے کے ہمیشہ ہی ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔

اس ضمن میں ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ مادی دنیا میں تو سائنس کی ایجادات بڑی مفید اور کارآمد ہیں، اور یہ جس قدر جلدی ہوں، اتنی ہی انسانیت کے حق میں بہتر اور مفید ہیں لیکن اگر انسان کی معاشرتی زندگی بھی ان ایجادات کی سی برق رفتاری کے ساتھ زیر و زبر ہوتی رہے تو یہ انسانیت کے لیے بڑی ہی مہلک ہے۔ انسانی اعمال کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ انھیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ان کی علت اسی وقت معلوم کر سکتے ہیں جب ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لے لیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں، جو بڑا ہی مشکل ہے، ہم اُس سرعت سے کام نہیں لے سکتے جس سرعت سے کہ سائنس اپنی ایجادات پیش کر رہی ہے۔

انسانی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ اُس کو سمجھنے کے لیے اس پر مختلف حیثیتوں سے ایک لمبے عرصہ تک غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بنا پر آپ ایک نئی مشین تو تھوڑے سے تھوڑے عرصہ میں تیار کر سکتے ہیں لیکن کوئی نئی قدر پیدا نہیں کر سکتے۔ دنیا کی جن اقوام نے اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لیا، اُن کا حشر ہمارے

سامنے ہے۔

جمہوریت اور آزادی کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ قوم اپنی روایات سے وابستہ رہے۔ روایات غیر محسوس طور پر بغیر کسی خارجی دباؤ کے کسی قوم کے افراد کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریز قوم کو دیکھیے۔ آخر کس چیز نے اسے جمہوریت پسند بنایا ہے۔ وہ صرف اس کی روایات ہیں۔ ان روایات نے اُس کی زندگی کو اتنا منظم اور متوازن بنا دیا ہے کہ خارجی دباؤ کی اُسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اسی وجہ سے انگریز کے ہاں آج انفرادی آزادی بھی ہے اور جمہوریت بھی۔ ان کی زندگی کا انداز، ان روایات کی وجہ سے اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بھی ان پر کسی قسم کی آمرانہ قیود عائد کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

انگریزی قوم کے برعکس، جرمن قوم نے ماضی کی روایات کو پس پشت ڈال دیا وہ پھر اتنی سرپھری اور بے لگام ہو گئیں کہ انھیں اوپر سے ایک جابر اور مستبد طاقت مسلط کیے بغیر ایک مرکز پر جمع نہ کیا جا سکا یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے اپنی روایات کے بندھنوں کو توڑا اسی وقت اُسے محسوس ہوا کہ اس کے وجود کے لیے ضروری ہے کہ اب وہ فسطائیت اور آمریت کے طوق اپنے گلے میں پہنے۔ ماضی سے بغاوت لازماً ڈکٹیٹرشپ پر منتج ہوتی۔ کیونکہ جب ایک قوم اپنے مرکز سے کٹ جائے تو اسے کوئی قوتِ قاہرہ ہی انتشار سے بچا سکتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج جو لوگ اس قوم کو ماضی سے انحراف کا سبق دیتے ہیں وہ ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اس انحراف کے بعد تعیین مرکزِ ملت، کا آہنی ہاتھ ہی ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کسی شخص کو مزید مطالعہ کرنا مقصود ہو تو (WILLIAM MONTGOMRY MECGERN) کی کتاب لوتھر سے ہٹلر تک (LUTHER TO HITLER) کا مطالعہ کرے۔ اسے خود بخود یہ معلوم ہو جائیگا کہ ماضی کی روایات کو ترک کر کے ایک قوم کس قدر پریشان حال ہوتی ہے اور اُسے ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے کس قسم کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

یورپین اقوام پر جس وقت بھی روایات کی گرفت ڈھیلی ہوئی، تو اُن کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ اس انتشار سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے انھیں اپنے گرد وطنیت کے حصار کھینچنے پڑے۔ اس طرح سے اُن کا وجود دوسری اقوام سے ممیز اور مشخص تو ہو گیا لیکن پھر انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی محرک ایسا ہونا چاہئے جو اُن کی قوموں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کر کے انھیں سرگرم عمل کرے۔ چنانچہ یہ کام بھی دوسری اقوام کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا کر کیا گیا۔ دورِ حاضر میں قومیں ایک دوسرے کے خلاف جو دشمنی، عداوت، اور رقابت کے شدید جذبات رکھتی ہیں، وہ دراصل اُن کی قومی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے بلکہ یہی منفی جذبات وہ سہارے ہیں جن پر اُن کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر وہ آج ان سہاروں کو چھوڑ دیں تو کل ہی اُن کا شیرازۂ قومی درہم برہم ہو جائے۔ یہ چیزیں اُن کے لیے اشد ضروری ہیں۔

یورپ میں ماضی سے بغاوت کے جو نتائج برآمد ہوئے، انھیں ہم ذیل میں مختصراً یوں درج کرتے ہیں:

- ماضی کی روایات سے بغاوت کے بعد، یورپ کی معاشرتی زندگی بڑی سرعت سے تہ و بالا ہونے لگی۔
- قوموں کو اپنے وجود قائم رکھنے کے لیے اپنے گرد وطنی، نسلی یا لسانی حصار کھینچنے پڑے۔
- جو قومیں ماضی سے بالکل کٹ گئیں وہ اس قدر سرپھری ہو گئیں کہ انھیں پھر ایک زبردست قسم کا آمرانہ نظام ہی، خواہ وہ نازی طرز کا ہو یا روسی طرز کا، جوڑ کر رکھ سکا۔

آئیے اب سب سے آخر میں یہ دیکھیں کہ کیا مسلم قوم کا ماضی بھی اسی قسم کا ہے جو اہلِ یورپ کا تھا؟ اور کیا اس قوم کو بھی جو روایات ورثہ میں ملی ہیں، وہ نوعیت کے اعتبار سے ویسی ہی ہیں جو یورپین اقوام کو ان کے اسلاف سے ملی ہیں؟ اور کیا ہم انھیں ترک کر کے کوئی ایسی قوتِ رابطہ اور ناظمہ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں جو ہمیں ایک ملت کی حیثیت سے زندہ رکھ سکے؟

جن لوگوں نے اسلام کا بالکل سطحی مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس حقیقت کو بیک نظر جان سکتے ہیں کہ اسلام اُن معنوں میں کوئی مذہب نہیں جن معنوں میں عیسائیت ہے۔ اسلام حیاتِ انسانی کے صرف ایک یا چند گوشوں کے متعلق بحث نہیں کرتا بلکہ وہ اُس کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں اس نے مفصل ہدایات نہ دی ہوں۔ یہاں زندگی کے حصے بخرے کر کے ان میں سے بعض خدا کے لیے اور بعض قیصر کے لیے وقف نہیں کیے۔ بلکہ انسان کی پوری زندگی کو ایک وحدت سمجھتے ہوئے، ساری کی ساری خداوند تعالیٰ کے تابع کی گئی ہے۔ اس

بنا پر جو روایات ہمیں اسلام نے دی ہیں، وہ ہمہ گیر ہیں۔ اُن سے ہمیں اپنے سارے معاملات میں خواہ وہ عبادت و ریاضت سے متعلق ہوں یا سیاست و معیشت سے سب کے بارے میں واضح ہدایات ملتی ہیں یہاں اس امر کی گنجائش نہیں رکھی گئی کہ کوئی شخص اپنے من گھڑت خیالات کو تعلیماتِ الٰہیہ کی حیثیت سے پیش کر سکے۔ پھر ان روایات سے زندگی کا جو نقشہ مرتب ہوتا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل اور مربوط ہے۔ اُس میں کسی قسم کا جھول نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ جو روایات مسلم قوم کو اپنے ماضی سے ملی ہیں، انھیں کبھی بھی اس قوم نے بوجھ نہیں محسوس کیا۔ اُن کی حیثیت اس ملت کے لیے ایک درخشاں اور روشن آئیڈیل کی سی ہے۔ جس کی طرف بڑھنے کا احساس ہی اس قوم کو زندگی کی حرارت بخشتا ہے۔ اسی کے آئینہ میں ہم مستقبل کی ترقی کا دلکش منظر دیکھ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے دل میں ہر دور میں یہ چبھتا ہوا احساس موجود رہا کہ جو کچھ انھیں ہونا چاہیے، وہ نہیں رہے، اُن کی زندگی کا نقشہ اُن خطوط پر مرتب نہیں جو ہادیٔ برحق اور اُن کے جلیل القدر اصحاب نے پیش کیا تھا۔

پھر ہماری قومی تاریخ میں مذہب و سائنس کی اُس کشمکش کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا جو یورپ میں ایک طویل عرصہ تک جاری رہی۔ قرآن حکیم نے لوگوں کو انفس و آفاق پر غور کرنے کی دعوت دی اور اسے آیاتِ الٰہی کو سمجھنے کا ایک نہایت ہی ضروری ذریعہ قرار دیا۔ ہمارے ہاں بلاشبہ دینی امور میں ایک دوسرے سے اختلافات بھی کیے گئے بلکہ بعض مواقع پر ان اختلافات کی وجہ سے کچھ لوگ قتل بھی ہوئے لیکن ہمیں پوری تاریخ میں آج تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی شخص نے کائنات پر غور کرنے سے اگر کچھ نتائج اخذ کیے ہوں تو اسے محض ان مظاہرِ قدرت پر غور و فکر کرنے کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو۔ ہمارے مذہب کے علمبرداروں کے ہاتھ کسی سائنس داں کے خون سے کبھی نہیں رنگے گئے بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے علمائے دین، سائنس دان، فلسفی اور حکیم بھی تھے۔

ہماری تاریخ ایک اور نقطۂ نظر سے بھی مسیحی تاریخ سے بالکل مختلف ہے۔ مسیح علیہ السلام کے اس کرۂ ارضی سے تشریف لے جانے کے بعد، بہت کم لوگ ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کے خانوں میں انہی کی پیش کردہ تعلیمات کے مطابق رنگ بھرے۔ اور اس طرح ہر عہد اور ہر دور میں اُن کی پاک اور مقدس زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں نہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پورے دین کو اس دنیا میں بالفعل نافذ کر کے دکھایا، بلکہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد، آپ کے رفقائے کار نے اسے کافی مدت تک علی حالہ قائم رکھا اور کوشش کی کہ اس متحرک اور تغیر پذیر رواں دواں زندگی کے ہر آن بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تعلیماتِ الٰہی کی تشریح کرتے رہیں تاکہ کسی وقت بھی امت اپنے آپ کو ایک خلا میں محسوس نہ کرے جس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پیشتر کسی مذہب سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چونکہ امتِ مسلمہ کی روایات ہر دور میں ان مصلحین اور مجددین کی کوششوں سے زندہ رہیں، اسی لیے انھوں نے اس قوم کے اجتماعی شعور اور سیرت کو دوسری قوموں کی بہ نسبت زیادہ قوی اور لازوال بنایا ہے۔ ہمارے ائمہ نے کبھی اس امر کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کسی دور میں بھی اسلام کی کوئی ایسی تعبیر پیش کریں جو ماضی سے بغاوت پر مبنی ہو۔ بلکہ اس امت کے اندر جب کسی فرد یا گروہ نے اس قسم کی مذموم کوشش کی تو امت کے اجتماعی احساس نے اسے کاذب اور فتنہ سمجھا۔ تاریخ کے اسی تسلسل کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت بھی برقرار رہی ہے اور انکی زندگی کی گاڑی بھی رکنے نہیں پائی

ہم جب امتِ مسلمہ کی ہیئتِ اجتماعی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس امت کی تشکیل نہ تو لسانی اور نسلی بنیادوں پر کی گئی ہے، اور نہ ہی، ملکی اور وطنی بنیادوں پر۔ اس کے مختلف اجزا کو جس چیز نے باہم ایک دوسرے سے مربوط کر رکھا ہے وہ چند اعتقادات ہیں، توحید، رسالت اور یوم جزا۔ انہی ایمانیات کی وجہ سے ملت قوم کو ایک ایسی زبردست قوتِ رابطہ و ضابطہ میسر آئی ہے جس نے رنگ و نسل، وطن و قوم کے وسیع اختلافات کے باوجود مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جس جذبے نے ان کے اندر ایک الگ ملت ہونے کا احساس پیدا کیا ہے، اسے ایک علیحدہ قوم کی تشکیل پر ابھارا ہے، وہ عقیدۂ ختم نبوت ہے۔ جمع اور تفریق کی یہ دو قوتیں اس ملت کے قیام کے لیے تو کافی ہیں، لیکن اس کے قیام کے بعد، اس کے افراد کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنے انھیں سرگرمِ عمل کرنے کے لیے، اسے چند ایسے عملی نمونے بھی درکار ہیں جن کی پیروی کا جذبہ، اس کی زندگی کو ہمیشہ متحرک رکھے، اور اسے ہر آن جدوجہد پر ابھارتا رہے۔ یہ نمونے ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پاکباز رفقائے کار کی زندگیوں میں ملتے ہیں۔ انھیں سے وابستگی اور محبت کی بدولت ہم میں سعی و عمل کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ ہم دوسری اقوام کی طرح اپنے آپ اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے غیر مطمئن ہو کر کوئی نئی اقدار کی تخلیق نہیں کرتے، کیونکہ

ہمارا دین ہر لحاظ سے مکمل ہے، بلکہ ہم ہمیشہ اس بات کی آرزو میں جیتے ہیں کہ کسی طرح اپنے آپ کو ان لوگوں کے رنگ میں رنگ لیں، جنہیں ہمارے عظیم الشان ماضی نے جنم دیا تھا۔ ہم اپنی مچلی ہوئی تمناؤں اور بے قرار کرنے والے خوابوں کی تعبیر مستقبل میں تلاش نہیں کرتے۔ بلکہ اُسے ماضی میں ڈھونڈتے ہیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے ہم جدوجہد کرتے ہیں، اسی کی بدولت ہمارے اندر عمل کی خواہش، کچھ ہونے کی آرزو، اور اپنی قوتوں کو ایک راہ پر ڈالنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ روایات ہمارے لیے باعثِ جاذبیت و کشش نہ ہوتیں، اور انھیں اپنانے کا ہمارے اندر ایک شدید احساس قائم نہ رہتا تو ہم آج تک صفحۂ ہستی سے کبھی کے مٹ چکے ہوتے۔

اس معاملہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صرف کتابوں میں محفوظ سچائیاں، خواہ وہ کتنی صحیح اور درست ہوں، ایک عام آدمی کے لیے کبھی مفید نہیں ہو سکتیں۔ ایک انسان کے لیے وہ اسی وقت قابلِ قبول ہوتی ہیں جب وہ پیکرِ محسوس میں جلوہ گر ہوں۔ آپ ہر بعد اخوت، مساوات، رواداری اور عدل کے الفاظ سنتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر لفظ آپ کی نگاہوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کرتا ہے۔ مثلاً میرے کانوں نے جب کبھی مساوات کا لفظ سنا ہے فوراً میرے ذہن میں حضرت عمرؓ اور حضرت بلالؓ آ گئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ اس لفظ کی عملی تعبیر ہے، اور میں اسی تعبیر کے ذریعہ اس لفظ کے مضمرات سمجھتا ہوں۔ ایک امریکن جب اسی لفظ کو سنے گا تو اُس کے سامنے کچھ دوسرے نقشے آئیں گے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی لفظ بغیر اُس کی عملی تشریح کے اپنے اندر کوئی معنویت رکھتا ہو۔ ہم جب بھی قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں فوراً ان نفوسِ قدسی کی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں آتی ہیں جنہوں نے اس کی تعلیمات کو ایک مثالی صورت میں اپنا کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ ان صورتوں کو نہ تو کوئی مسلمان فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کر سکتا ہے۔ یہ معیار ہمیں اپنے ماضی کی روایات ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔

بعض لوگ بڑی ناسمجھی کی بنا پر یہ کہہ دیتے ہیں مسلمانوں کی روایات نے ان کے اندر انتشار پیدا کیا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ انھیں روایات کی وجہ سے انھیں ایک وحدت نصیب ہوئی ہے۔ اگر روایات کا یہ ترکہ ہمیں ورثہ میں نہ ملتا، تو ہر سر پھرا جس طرح چاہتا مروڑ توڑ کر تعلیماتِ الٰہی کی تعبیر کر لیتا۔ یہ انہی روایات کا اعجاز ہے کہ قوم کا ایک ایسا اجتماعی شعور بن چکا ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کے اندر کسی فتنے کو گھسنے نہیں

دیتی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اندر کسی ایسی تعبیر کو گوارا نہیں کیا جس کی تائید حضور سرورِ کائنات اور صحابۂ اکرام رضی اللہ عنہم کے اُسوے سے نہ ملتی ہو۔

آخر میں ہم ایک گذارش اُن حضرات سے کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو بڑی نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا جب تک کوئی جدید ایڈیشن پیش نہ کیا جائے یہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ حضرات سخت دھوکے میں مبتلا ہیں۔ وہ نہ تو اس قوم کی ہیئتِ اجتماعی کو سمجھتے ہیں، نہ ہی اس کے مقاصد سے واقف ہیں اور نہ ہی اس کے مزاج کے شناسا۔ مسلم قوم صرف رضائے الٰہی کے لیے دنیا میں زندہ ہے اور اسی کا حصول اس کا معراج ہے۔ آپ خود ہی سوچیے کہ آخر اس منزل کی طرف سب سے صحیح رہنمائی کون کر سکتا ہے — وہی ذاتِ اقدس جس پر قرآن کریم نازل ہوا، اور وہی پاکباز لوگ جو اُس بلند و برتر ذات کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ اسی وجہ سے اس کے ماضی کی حیثیت آثارِ قدیمہ کی نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید آئیڈیل کی ہے، جس سے اس کا وجود قائم ہے، جس سے یہ زندگی کی حرارت حاصل کرتی ہے۔ آپ نے اگر ایک دفعہ اس کا اپنے ماضی سے رشتہ منقطع کر دیا، اس کی روایات سے اسے الگ کر لیا تو پھر خواہ یہ کتنی ہی ترقی کرے، لیکن امتِ وسط اور شاہد علی الناس کی حیثیت سے مٹ جائے گی۔ اس کا حشر پھر وہی ہوگا جو لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ مذہب نے مسیحیت کا کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بُرا ہوگا۔ یورپین اقوام نے تو مذہب کی گرفت کمزور ہو جانے کے بعد پھر اپنے آپ کو خاک و خون کے رشتوں میں منسلک کر کے کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ کو زندہ رکھا ہے لیکن یہ قوم جس نے رنگ و نسل کے امتیازات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اس سہارے کو چھوڑ کر آخر کس سہارے پر زندہ رہے گی؟